ناتھ آزاد نے اپنے مقالہ میں کوئی نئی بات نہیں کی۔ ناصر کاظمی نے اپنے میر والے مقالہ میں اقبال سے موازنہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے' ڈاکٹر صاحب نے اسے ہی دہرا دیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے جواب میں کہا کہ ''میں نے تو ناصر کاظمی کا مقالہ پڑھا ہی نہیں۔ کب شائع ہوا' کہاں شائع ہوا؟''

عمیق حنفی نے اپنے تیز لہجہ میں کہا کہ ''اگر آپ نے وہ مقالہ نہیں پڑھا ہے تو ایسا کیوں ہے کہ ناصر نے وہاں میر اور اقبال کے جو شعر اپنے استدلال کے ذیل میں پیش کیے ہیں' وہی آپ نے بھی نقل کیے ہیں۔''

مگر باقر مہدی کی سنئے۔ ہونگ میں موصوف کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ شاید وہ جامعہ کا افسانہ سیمینار تھا۔ اس نشست کی صدارت ایک مسلمان وزیر کر رہے تھے۔ نام یاد نہیں آ رہا۔ انہوں نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ایک شعر میر کا بتا کر پڑھا۔ باقر مہدی نے فوراً شور مچایا۔ ''غلط' غلط۔ یہ شعر میر کا نہیں ہے۔''

وزیر موصوف نے اصرار کیا کہ یہ شعر میر ہی کا ہے اور کہا کہ ''جلسہ کے بعد ہم آپ سے ملتے ہیں۔ میں بتاؤں گا کہ یہ شعر میر ہی کا ہے۔''

جواب میں بولے۔ ''میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ آپ سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

باقر مہدی کہیں 1962ء یا 1963ء کے آس پاس لاہور آئے تھے۔ اس وقت ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ پر اعتبار کر لیا اور اعتماد میں لے کر بتایا کہ انہوں نے جس حسینہ سے عشق کیا تھا' وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئی ہے اور لاہور میں ہے۔ اسے تلاش کرنا ہے اور ملنا ہے۔ عشق کے معاملات میں' میں نے دوستوں سے ہمیشہ تعاون کیا ہے۔ خیر تلاش کے مراحل تو انہوں نے اکیلے ہی طے کیے۔ جب اتا پتا مل گیا تب مجھ سے تقاضا کیا کہ میرے ساتھ چلو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمت بندھانے کی خاطر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ویسے جیسا انہوں نے بتایا تھا' ویسا ہی پایا مگر پتہ یہ چلا کہ آگ یکطرفہ لگ رہی تھی اور اس طرح سلگ رہی تھی کہ اس ماہ رو کو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔

دوسری بار باقر مہدی آئے تو آگ بجھ چکی تھی۔ آگ سلگنے کے لیے آخر ایندھن بھی تو سپلائی ہوتا رہنا چاہیے۔ اب کے وہ کشور ناہید کے مہمان تھے۔ کشور نے اپنے دستور کے مطابق مہمانداری تو بہت کی مگر باقر مہدی ایک ہی فقرہ دہراتے رہے کہ موصوفہ سے ہماری ملاقات نہیں ہو پا رہی۔ یہ فقرہ کہتے کہتے ہی رخصت ہو گئے۔

بھلا ملاقات ایسے ہوا کرتی ہے۔ یہ کوئی انقلاب تھوڑا ہی ہے کہ نعرہ لگایا اور سمجھ لیا کہ حق ادا ہو گیا۔ اس کے آداب اور ہیں۔

باقر مہدی بمبئی میں رہتے ہیں۔ بمبئی تو مجھے بس ایک ہی حوالے سے یاد رہ گیا ہے۔ اس حوالے سے کہ یہاں میں نے ایک افسانہ نگار کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ماش کی دال کھائی تھی۔ سریندر پرکاش نے مجھے یہی کہہ کر اپنے گھر بلایا تھا کہ میں ماش کی دال بہت اچھی پکاتا ہوں۔ آپ کھا کر خوش ہوں گے۔ میں کھا کر واقعی خوش ہوا۔ اس کے بعد میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ سریندر پرکاش افسانہ زیادہ اچھا لکھتا ہے یا ماش کی دال زیادہ اچھی پکاتا ہے۔

اس کے بعد سریندر سے میری دوسری ملاقات برلن میں ہوئی۔ وہاں ہاؤس آف ورلڈ کلچر کی طرف سے ایک اردو فیسٹیول کا اہتمام تھا۔ ادھر سے میں گیا تھا اور جمیل الدین عالی۔ لندن سے افتخار عارف آن پہنچے تھے۔ ہندوستان سے قرۃ العین حیدر، سریندر اور بلراج کومل۔

صبح منہ اندھیرے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چائے کی ٹرے لیے سریندر کھڑے ہیں۔ ارے یہ کیا، یہ بیڈ ٹی ہے۔ بس پھر یہ طور بندھ گیا کہ روز صبح منہ اندھیرے دروازے پر دستک، سریندر چائے کی ٹرے کے ساتھ حاضر۔ میں دل میں سوچ کر خوش ہوا کہ کتنا سعادت مند افسانہ نگار ہے۔ ایسی سعادت مندی ہماری پرانی شعری روایت سے منسوب تھی۔ شاگرد استاد کا اور جونیئر سینئر کا کتنا ادب کرتے تھے۔ چلمیں بھرتے تھے۔ جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ کمبخت نئے زمانے نے تو ساری روایتوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ نہ بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں پر شفقت۔ میں نے سریندر کے حق میں دعا کی کہ لمبی عمر پائے۔ کڑوے نیم سے بڑا ہو۔ ہاتھ میں ذائقہ اور قلم میں زور برقرار رہے۔ اسی طرح اچھی دال ماش پکاتا رہے اور اچھا افسانہ لکھتا رہے۔

اے لو میں پھر دوستوں کا ذکر لے کر بیٹھ گیا۔ سوچا میں نے یہ تھا کہ پچھلے برسوں میں ہندوستان کے جتنے سفر کیے ہیں، ان کی یادوں کو تازہ کیا جائے مگر یادیں اسی ہنگام جتنی قلمبند ہو سکیں، ہو گئیں۔ اب تو سب کچھ حافظہ کے عقب میں جو ایک مال گودام ہے، اس میں چلا گیا اور سفر کے قیمتی لمحات خوابوں میں ایسے رل مل چکے ہیں کہ خوابوں ہی کا حصہ بن گئے ہیں۔ میں ذہن دوڑا رہا ہوں، یادوں کو کھینچ کھینچ کر دھیان میں لا رہا ہوں۔ یادیں ہیں کہ شریر بچوں کی طرح مارے باندھے قریب آتی ہیں اور بھاگ جاتی ہیں۔ یہ بنارس نگری ہے۔ عالیہ کا میکہ۔ نوابوں والی گلی۔ عالیہ کی پھوپھی اماں کی حویلی۔ مغل باجی عزا خانے کا دیدار کراتی ہیں۔ پھر اداس ہو جاتی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ اب کے برس مولا کی سواری نہیں آئی۔ شب عاشور استاد بسم اللہ خان دستور کے مطابق اپنی شہنائی کے ساتھ آئے۔ شب بیداری کی مگر شہنائی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب پو پھٹی اور ذوالجناح نکلنے کے لیے تیار ہوا تو استاد کو ٹہوکا۔ استاد۔ اب تو ذوالجناح نکلنے لگا ہے، کیا شہنائی نہیں بجے گی۔ استاد اداس ہو کر بولے، مولا کی طرف سے حکم نہیں آیا۔ بس پھر شہنائی کے بغیر ہی

ذوالجناح کی سواری نکلی۔ کتنی اداسی تھی سواری پر۔ مولا کی سواری پر۔ مولا کی سواری جو نہیں آئی تھی۔

اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس عزا خانے سے سارناتھ کتنی دور ہے۔ کل مجھے وہاں جا کر گوتم بدھ کے استھان پر حاضری دینی ہے۔ اشوک کے پیڑ یہاں سے وہاں تک قطار باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے پتے کیسے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور وہ گنبد بے در ایک بڑے گھیر والا اونچا ستون اس کے اندر کیا ہے' کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کوئی در نہ دریچہ' نہ کنگرے نہ طاق۔ جہاں تہاں سوراخ ہیں جن میں سے طوطے آ جا رہے ہیں۔ آگے وہ مقام جہاں کبھی ہرن بن تھا اور جہاں گوتم بدھ نے گیان حاصل کرنے کے بعد پانچ جوگیوں کو مخاطب کر کے پہلا اپدیش دیا تھا۔

تو صاحبو ہم نے گوتم بدھ کے پہلے اپدیش کا استھان دیکھ لیا۔ چلو اب ایک دوسرا استھان بھی دیکھ لیں۔ شرادستی جہاں بدھ جی مہاراج برکھارت میں باس کیا کرتے تھے مگر اس کے لیے تو الہ آباد جانا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ وہاں شمس الرحمن فاروقی رہتے ہیں۔ انہیں میں نے پہلے تو دلی میں دیکھا تھا مگر پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے تو شمس الرحمن فاروقی اب الہ آباد میں اپنے استھان پہ آ کر بیٹھ گئے ہیں اور بھاری نظر آتے ہیں۔ میں نے ان کی انگلی پکڑی ہے اور شرادستی کی طرف اڑا چلا جا رہا ہوں مگر وہاں اب دیکھنے کو ہے کیا۔ اینٹوں کو دیکھو اور تصور کر لو کہ آگے پراچین کال میں یہاں یہ ایک نگری تھی۔ بدھ دیو جی برسات کی برسات یہاں براجتے تھے۔ اس سے اسے چار چاند لگ گئے۔ اب نہ وہ ہستی' نہ وہ بستی۔ نہ چھوڑی وقت نے جس کی نشانی۔ تو آگے چلتے ہیں یعنی جب پراچین کال میں داخل ہو ہی گئے تو پھر جس انتہا تک جا سکتے ہو جاؤ اور یہاں انتہا تک جانے کی گنجائش موجود ہے۔

تو شمس الرحمن فاروقی آگے آگے' ہم پیچھے پیچھے۔ لو رامائن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ او بڑ کھابڑ اونچے نیچے اجاڑ رستوں پر چلے جاتے ہیں۔ جس رستے پر ہماری موٹر دوڑ رہی ہے' اس راستے پر اس پراچین سمے میں رام چندر جی کا رتھ تخ تخ کرتا گنگا کے کنارے آیا تھا۔

آگے کی کہانی اس کنارے بیٹھے ایک پجاری نے سنائی۔ تب شری رام چندر جی شری گنگا جی کو دیکھ کے رتھ سے اترے اور گنگا جی کو ڈنڈوت پرنام کیا۔ پھر اشنان کیا اور مہاپوتر گنگا جل پیا۔ بس پرسن ہو گئے

رام لکھن سیہ روپ نہاری
کہیں پریم نگر نرناری
تے پت مات کہو سکھی کیسے

جن	پڑھے	بن	بالک	ایسے
تب	نکھا	دیت	ارا	انمانا
تر	سنپا		منوہر	جانا
لے	رکھنا	تھے	ٹھاون	بتاوا
کہیو	رام	سب	بھانت	سہاوا

اچھی بات یہ ہے کہ اس مقام پر کوئی بڑا مندر تعمیر نہیں ہوا۔ مندر بن جاتا تو پھر یاتریوں' بچاریوں' جوگیوں' بیراگیوں کا بھیڑ بھڑکا ہوتا۔ قدامت کا احساس ملیامیٹ ہو جاتا۔ اب یہ مقام اپنے اجاڑپن میں قدامت کی دولت کو سنگھوائے بیٹھا ہے۔ گنگا چپ چاپ بہہ رہی ہے۔ برابر میں ایک اجڑی بجڑی دھرم شالہ۔ وہاں ڈھائی تین پجاری مجھے تو اتنے ہی نظر آئے تھے۔

تو لیجئے تھوڑی دیر رامائن کی فضا میں بھی سانس لے لیا۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا۔ گنگا جمنا کا میل' سو وہ تو الہ آباد میں آ کر خلقت دیکھتی ہے۔ میں نے بھی یہ ملاپ دیکھ لیا۔

شمس الرحمن فاروقی کو دعائیں دیتے واپس ہوئے۔ شمس الرحمن فاروقی اس معاملہ میں کمال کے آدمی تھے۔ انہیں کے طفیل میں نے بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں جا کر کتنی چوکھٹیں دیکھ ڈالیں ورنہ ہماری مار تو بس حضرت نظام الدین اولیا کی چوکھٹ تک تھی۔ بہت تیر مارا تو خواجہ بختیار کاکی کی چوکھٹ کو جا چھوا مگر وہ جو دور پرے ایک مبارک چوکھٹ ہے جسے میں موروں والی چوکھٹ کہتا ہوں۔ وہاں اگر فاروقی صاحب نے لے جاتے تو میں کہاں دیکھ پاتا۔ حضرت چراغ دہلی کی چوکھٹ۔ اس درگاہ پر موروں کا راج ہے۔ چراغ دہلی کی اس ایک ادا نے مجھے لوٹ لیا۔ ان کے ملفوظات (سراج المجالس) میں پہلے ہی قائل بلکہ کشتہ چلا آتا تھا۔

باقی دلی تو عالم میں انتخاب شہر تھا۔ اب بھی ہے۔ جتنا دیکھو اتنا ہی تھوڑا مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ میں تھوڑا دیکھ کر بھی خوش اور مطمئن ہو جاتا ہوں۔ پہلے پھیرے میں شمیم حنفی نے مجھے جامعہ نگر کے پرے لے جا کر جمنا کا کنارہ' کچھ مور' کچھ بندر دکھائے۔ میں اسی میں خوش ہو گیا۔ اب بھی حافظہ میں وہ پیلا کھیت رچا بسا ہوا ہے جہاں گیندے کے پھولوں کے بیچ بیچ میں سے موروں کی لمبی گردنیں ابھری دکھائی دے رہی تھیں۔

میری یادوں میں کتنی یادیں ایسی ہیں جن کا کسی شخصیت سے' کسی تاریخی عمارت سے' کسی ادبی محفل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس کسی پرندے کی اڑتی سی جھلک یا دور سے آتی ہوئی اس کی آواز۔ اورنگ آباد کی ساری باتیں بھول گیا۔ بس اس نگری کی کوئلیں یاد رہ گئی

ہیں۔ سراج اورنگ آباد کی قبر بھی بس اسی نسبت سے حافظہ میں ٹکی رہ گئی ہے کہ اس کے متصل ایک درخت پہ کوئلیں ہی کوئلیں' کوئل تو اکیلی پتوں میں چھپی کوکتی رہتی ہے۔ اس کی کوک سنو اور خوش ہو جاؤ۔ درشن وہ تمہیں دے گی نہیں مگر یہاں اس نے درشن بھی دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ ہمیشہ اکیلی نہیں ہوتی۔

اورنگ آباد تو میں اجنتا ایلورا کی دید کے چکر میں گیا تھا۔ ٹک دیکھ لیا' دل شاد کیا اور بھول گیا۔ اب وہ غار اور وہ بت اور وہ نقش کہ چٹانوں کے بیچ کہیں منور ہیں' کہیں اندھیرے میں گم ہیں۔ اب بس اس طرح یاد ہیں کہ جیسے ایک خواب دیکھا تھا۔ پورا خواب بھول گیا۔ جہاں تہاں سے اس کے کچھ منظر حافظہ میں اٹکے رہ گئے ہیں۔

ہر پھر کر پھر وہی دلی پھر وہی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ ریوتی کے گھر سے چلے شمیم حنفی کے گھر جا براجے۔ وہی گنے چنے چہرے یعنی وہی میاں زبیر رضوی' وہی میاں محمود ہاشمی' محمود ہاشمی کی اپنی دھج ہے۔ ہر وقت کلے میں پان کا بیڑا دبا ہوا۔ بہت لکھا مگر سنگھوانا نہ جانا۔ ایسے پرندے بھی تو ہوتے ہیں کہ انڈے دے کر بھول جاتے ہیں۔ یاد بھی رکھیں گے تو اس طرح کہ انڈوں کی گنتی یاد نہیں۔ خیر محمود ہاشمی اور عبید صدیقی کو تو میں نے اب میرٹھ کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ وہی تو مجھے میرٹھ لے کر گئے تھے۔ سوچا تھا کہ پرانے کوچوں کی شکلیں نہیں پہچانی جاتیں۔ خیر نگر بازار' گھنٹہ گھر' ویلی بازار' سب شکل سے بے شکل ہو چکے ہیں اور صدر بازار' ارے اس علاقے کی کیا پوچھتے ہو۔ کتنا پر امن اور خوبصورت علاقہ تھا۔ اب اس کا حال ابتر ہے۔ میں نے تعلیم کے ابتدائی برس تو اسی نواح میں گزارے تھے۔ ہمارے چچا جان تھے فضل الرحمن' ان کے بیٹے ہمارے ہمجولی انیس الرحمن ان کے گھر رہتے تھے۔ اس کی پر سکون سڑکیں اس وقت تصور میں ابھری ہوئی ہیں۔ یہ سڑک جو اتنی خاموش ہے اور دور تک کوئی پیادہ کوئی سوار نظر نہیں آتا کونسی ہے اور یہ عمارت جیسے محل کھڑا ہو۔ یہ قصر مصطفیٰ ہے۔ مصطفیٰ خان شیفتہ سے اسے نسبت ہے۔ اب یہاں نواب اسماعیل خان رہتے ہیں اور یہ سڑک کہ دور رویہ گھنے درخت کھڑے ہیں۔ کمپنی باغ کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر کالی مخلوق کم بلکہ بہت ہی کم نظر آئے گی۔ جو نظر آئے گا' گورا نظر آئے گا۔ سفید نیکر' سفید قمیص' سفید کرمچ کا جوتا۔ ہاتھ میں سفید ریکٹ۔ قدم مارتے کمپنی باغ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر ٹینس کھیلیں گے۔ کمپنی باغ میں داخل ہوں تو پھر کالی مخلوق کمیاب بلکہ نایاب۔ گورے گورے بچے چل پھر رہے ہیں۔ کھیل رہے ہیں۔ آیائیں ان کے ساتھ ہیں اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ وہ گوری مخلوق کہاں گئی اور وہ مصفا سڑکیں کہاں گئیں۔ اب تو یہاں کالی مخلوق کا بھیڑ بھڑکا ہے۔ ہاں یہیں کہیں تو وہ پارک تھی جہاں سے سن 57ء کی بغاوت شروع ہوئی تھی۔ سنا تھا کہ 1957ء میں آ کر کوئی یادگار کھڑی کی گئی تھی مگر عبید صدیقی اور محمود ہاشمی نے مجھے ادھر جانے کب دیا۔ مجھے میرٹھ کالج کی طرف

دھکیلا اور میں دھکلتا چلا گیا۔

کم از کم اس کوچے جہاں کا ہمارا کالج ہے' سکون برقرار ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ کالج میں اس وقت کوئی گہما گہمی نہیں۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ امتحان ہو رہے ہیں۔ دور لان میں کچھ کرسیاں بچھی ہیں۔ کچھ پروفیسر قسم کے لوگ بیٹھے ہیں۔ پتہ چلا کہ یہ پرنسپل صاحب ہیں' باقی ان کے حواری۔ پکار پڑتی ہے کہ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر صاحب ہوں تو وہ آئیں اور پاکستان سے آئے مہمان سے ملیں۔ لیجئے وہ آ گئے اور بہت گرمی میں بول رہے ہیں۔ ''دیکھئے پچھلی مرتبہ آپ دلی آئے۔ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ میرٹھ کالج میں اردو ڈیپارٹمنٹ بند پڑا ہے۔ غلط کہا۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ آپ اس وقت تک جا چکے تھے۔ بند کب ہوا۔ ارے صاحب یہاں تو یوپی کے سب کالجوں سے زیادہ اردو کے طالب علم ہیں۔

''بھلا کتنے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایم۔ اے کی کلاسوں میں تیس' بی اے میں پچاس۔''

میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ ہندوستان میں اردو کی جو بھی صورت ہو' کم از کم ہمارے کالج میں تو اس کا حال اچھا ہی ہے اور خود کالج کا حال اچھا نظر آیا۔ چلئے میرٹھ میں کوئی کوچہ تو ایسا ہے جسے دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک کوچہ اور بھی ہے۔ سپٹ بازار کے اس طرف تحصیل کے پیچھے وہ جو ریوڑیوں کا کوچہ ہے' اس کوچے کی شناخت برقرار ہے۔ ریوڑی برقرار ہے۔ ریوڑی کا ذائقہ برقرار ہے تو پھر گویا میرٹھ بھی برقرار ہے۔

مگر میں یہ کیوں توقع کر رہا ہوں کہ میرٹھ کو میں ویسا ہی پاؤں گا جیسا اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ خیر نگر کے نکڑ پر ٹال اسی طرح برقرار ہو گی' اسی طرح وہاں لکڑیاں چر رہی ہوں گی اور تل رہی ہوں گی۔ اسی طرح وہاں لاریوں کا اڈا ہو گا اور اسی طرح بوم ہاپوڑی پکار رہے ہوں گے ''بوم ہاپوڑی کا چماری نامہ آ گیا۔ دو آنے میں۔'' کوٹھی جنت نشان' مصطفیٰ کیسل' نادر علی بلڈنگ' سب عمارتیں اسی طرح ہوں گے۔ وہی ان کی شان ہو گی۔ زمانے نے بھلا کبھی چیزوں کو' آدمیوں کو' عمارتوں کو' گلی کوچوں کو ایک حال میں رہنے دیا ہے اور یوں بھی تو ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں بدلتا۔ پھر بھی آپ سوچتے ہیں کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ جب میں نے پاکستان جانے کے بعد پہلا پھیرا ہندوستان کا لگایا تو یہی ہوا تھا۔ زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو سال کے بعد میرا پھیرا ہوا تھا۔ جب میں نے ہاپوڑ میں قدم رکھا تو سب کچھ اسی طرح تھا۔ سارا نقشہ وہی مگر میں سمجھ رہا تھا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ اصل میں ہاپوڑ کے ساتھ اب میرا رشتہ بدل چکا تھا۔

جب میں دو ڈھائی دن ہاپوڑ میں رہ لیا تو میں نے پھر یری لی' چلو دلی۔ ہماری ہمشیرہ صاحبہ نے جو سنا تو خوفزدہ لہجے میں بولیں ''دلی۔ ارے تیرا دماغ خراب ہے۔ دلی میں تیرا کون بیٹھا ہے۔ ریوتی تو خود آ کر مل گیا۔'' اصل میں 1947ء والی دلی کی قیامت کو وہ ابھی بھولی نہیں تھیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ''سرلا سے جا کر ملنا ہے۔''

''اس کے پیروں میں کیا مہندی لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی ہاپوڑ کا پھیرا لگا جائے۔''

''اس غریب کو ہاپوڑ میں کوئی قدم رکھنے دے گا۔ آپ کو پتہ نہیں ہے۔ یہ شادی کیسے ہوئی ہے۔''

اس پر انہیں لاجواب ہونا ہی تھا۔ بہر حال انہوں نے امام ضامن باندھ کر اور قرآن کی ہوا دے کر مجھے رخصت کیا اور ہمارے بہنوئی صاحب نے ہدایت کی کہ جب گاڑی سے اتر و اور سٹیشن سے نکلو تو سات مرتبہ نادعلی پڑھ لینا۔''

لیجئے ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ دلی آ گئی مگر عجب احوال تھا۔ وہی جمنا کا پل' وہی لال قلعہ کی فصیل' وہی گاڑی کا ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ پل سے گزرنا۔ اسی طرح مسافروں کا ندی میں سکے پھینکنا اور شور مچانا جمنا میا کی جئے۔ مگر مجھے ایک عجب طرح کی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سارے گردوپیش سے میرا رشتہ بدل چکا تھا۔ خیر اتنا میں نے ضرور کیا' جیب سے ایک پاکستانی سکہ نکال کر جمنا کی نذر کیا۔ یہ سوچ کر کہ اب جانے پھر کب جمنا سے ملاقات ہو اور اس کے بعد میں نے نادعلی پڑھنی شروع کر دی۔

ریوتی کے نئے ٹھکانے کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا لودی کالونی پہنچا۔ لیجئے فلیٹس تک تو پہنچ گیا مگر فلیٹوں کے اس بے انت سلسلہ میں ریوتی کے فلیٹ کو کیسے تلاش کیا جائے۔ سامنے برآمدے میں چند عورتیں بیٹھی کاڑھہ بن رہی تھیں۔ میں نے جا کر ان سے پتہ پوچھا۔ انہوں نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس شک کی ذمہ داری میری اچکن تھی۔ ویسے تو وہ اگست کا مہینہ تھا مگر اس زمانے میں گرمی برسات جو بھی موسم ہو خالی کرتے پائجامے میں شرفا ڈیوڑھی سے قدم نہیں نکالتے تھے۔

خیر پتہ تو تھوڑے تامل کے بعد ان بیبیوں نے بتا دیا مگر پھر ہوا یوں کہ میں نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا اور سرلا سے خیر و عافیت کی بات ہو رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سرلا نے دروازہ کھولا تو سامنے انہیں عورتوں میں سے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے کچھ پوچھا۔ سرلا نے جواب دیا۔ وہ شرما جی کے متر ہیں اور میرے بھیا ہیں۔

پھر اس نے کچھ پوچھا اور سرلا نے جواب دیا ''ہاں مسلمان ہیں مگر آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' روکھے سے لہجے میں کہا کہ اس بی بی کو جلدی ہی رخصت ہو جانا پڑا۔

ادھر میرے دل میں خوف سمانا شروع ہوا مگر خیر جلدی ہی ریوتی دفتر سے چھٹی کر کے آن پہنچا اور وہ خوف فوراً کے فوراً زائل ہو گیا۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ اس پھیرے کے بعد پھر کیا ہوا کہ زمانہ گزر گیا اور قدم اس طرف کے لیے نہیں اٹھے۔ ایک جنگ آئی اور گزر گئی۔ خدا خدا کر کے رستے تھوڑے تھوڑے کھلے۔ پھر دوسری جنگ آن ٹوٹی۔ پھر رستے بند۔ بس اسی میں تیس بتیس سال گزر گئے۔ اس کے بعد کہیں دلی کے سفر کی صورت پیدا ہوئی۔

دلی اس عرصہ میں اور سے اور ہو چکی تھی۔ جیسے یہ گلی کوچے اور جیسے یہ امنڈتی ہوئی خلقت اور ہو۔ اور جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا تو وہاں بھی ایک نئی تانتی ظہور میں آ چکی تھی۔ اس درمیان ریوتی کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ وہ بچوں سے جوان ہوئے۔ پھر ان کی بیاہ شادیاں ہوئیں۔ پھر ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے تو اب گھر بھرا ہوا تھا۔ بیٹے' بہوئیں' پوتیاں' پوتے مگر جس کے دم کا یہ ظہور تھا' وہ ان کے بیچ موجود نہیں تھی' وہ بیکھنٹ سدھار چکی تھی۔

مگر یہ تو زندگی کا عمل ہے۔ اس کی اوبڑ کھابڑ چال ہمارے جذبات و احساسات کو کب خاطر میں لاتی ہے۔

لو اس گھر کے ذکر سے یاد آیا۔ ایک دوست کو تو میں بھول ہی چلا تھا۔ وہ سنگھ ہے۔ مت سمجھئے کہ وہ سکھ ہے۔ وہ عیسائی ہے۔ اس گھر میں جا کر اترتا ہوں تو مجھے اس کی یاد آتی ہے۔ بڑھتی عمر کسے نہیں ستاتی۔ اسے زیادہ ستا رہی ہے۔ لنگڑاتا لنگڑاتا آتا ہے۔ آتے ہی ریوتی کے خلاف ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک ایک اس کی برائیاں گناتا ہے۔ جب دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے اور کہنے کو کچھ نہیں رہتا تو مطمئن واپس جاتا ہے۔

ہمعصر تو خیر ہوئے' اور یار دوست بھی ہوئے۔ مگر ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو دم بھر کے لیے ملتے ہیں مگر آپ پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ تو مجھے اسی گھر کے حوالے سے ایک نوجوان ڈاکٹر یاد آ رہا ہے۔ ہوا یوں کہ مجھے جاڑے بخار نے آ لیا اور حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ چھوٹی بہو منیکا نے میری حالت غیر دیکھی تو موٹر میں ڈال اسی نواح میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ایک سمارٹ سکھ نوجوان۔ منیکا جلدی جلدی تعارف کراتی ہے۔ ''یہ ہمارے بابو جی کے متر ہیں۔ پاکستان کے بہت بڑے لیکھک ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔ انہیں یاں پہ یا ترا ایوارڈ ملا ہے۔'' ڈاکٹر جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ اپنے کام سے کام۔ دیکھتا ہے۔ حال پوچھتا ہے۔ نسخہ لکھ کر دیتا ہے۔ پرہیز بتاتا ہے۔ منیکا پرس کھول کر فیس کی رقم نکالتی ہے تو فیس لینے سے صاف انکار کر دیتا ہے'' ''یہ تو ہمارے مہمان ہیں فیس کیسے لوں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''اصل میں میں ادھر ہی کا ہوں۔ خیر میں تو نہیں۔ میری تو پیدائش یہیں کی ہے۔ ہمارا

خاندان لائلپور میں رہتا تھا۔ بٹوارہ ہوا تو ماتا پتا یہاں آ گئے۔'' پھر منیکا سے مخاطب ہے ''شام کو مجھے حال ضرور بتانا۔ آٹھ بجے تک میں کلینک میں ہوں گا۔ پھر مجھے اپنی بہن کی طرف جانا ہے۔ میری بہن کا فون نمبر بھی لکھ لو۔ اس کے بعد گھر پر ملوں گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جس وقت بھی ہو یہ فون نمبر تمہارے پاس ہے۔ میں جہاں بھی ہوں مجھے فون کر کے بتانا۔''

اچھا ایسے ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر ہونا کیا ضرور ہے۔ بھلا آدمی کسی بھی روپ میں کسی بھی موڑ پر آپ کو مل سکتا ہے جیسے وہ سٹیشن ماسٹر تھا جس کا اڑتا اڑتا ذکر میں اپنے ایک سفرنامے میں کر چکا ہوں۔ شاید وہ بھسادل کا سٹیشن تھا۔ ایجنتا کی یاترا سے فارغ ہو کر سٹیشن پہنچے تو پتہ چلا کہ ہماری نشستوں کا توریز رویشن ہے ہی نہیں۔ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ریلوے والے لفٹ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر۔ گاڑی آنے والی ہے۔ یہ گاڑی نکل گئی تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔ اور سٹیشن ماسٹر نے روکھا جواب دے دیا ہے۔ ''کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔'' مگر تھوڑی دیر بعد اچانک اسے کچھ خیال آتا ہے۔ ''آپ لوگوں میں سے لاہور کا بھی کوئی ہے۔''

''میں ہوں۔''

''اچھا آپ لاہور کے ہیں۔ اچھا تو گوالمنڈی کا کیا حال ہے۔''

''گوالمنڈی شاد آباد ہے۔''

''اور ایف سی کالج؟''

''ایف سی کالج ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اصل میں ہم گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ ایف سی کالج میں پڑھا ہوں۔ آپ شاید جانتے ہوں اردو کے ایک کوی تھے پنڈت تلوک چند محروم۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔''

''سبحان اللہ۔'' میں نے کہا ''پھر تو دور کے رشتے نکل آئے۔ اور اب گاڑی میں جگہ نہ ملی تو ہم آپ ہی کے گھر چل کر بسیرا کریں گے۔''

''اچھا کچھ کرتا ہوں۔''

اپنے دفتر میں ہمیں لے جاتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر اپنے کسی افسر کو فون کر کے کچھ باتیں کرتا ہے۔'' پھر ہمیں نوید دیتا ہے کہ ''کام بن گیا۔ ہمارے ایک افسر نے اپنے فیملی کے لیے دو کوپے ریزرو کرائے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ پاکستان کے کچھ مہمان ہیں۔ ان

کی سیٹیں ریزرو نہیں ہیں۔اس نے اپنا ایک کوپے آپ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

خوب۔اچھے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔یہ ہندوستان ہے۔دور سے وہاں کے لوگ کیا نظر آتے ہیں۔قریب جا کر کیا نکلتے ہیں۔یہ فقرہ تھوڑی ترمیم کے ساتھ میں نے اپنے ایک دوست کی بیگم سے مستعار لیا ہے۔یہ دوست کون ہے۔اور اس کی بیگم کون ہے۔

میکاری یونیورسٹی کے آئن بیڈفورڈ نے لاہور میں گھومتے پھرتے الل ٹپ افسانوں کا ایک مجموعہ.....

''An Unwritten Epic and other Stories'' خرید لیا۔میری کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا ایک انتخاب' مرتبہ محمد عمر میمن۔ان میں ایک کہانی ''ایک بن لکھی رزمیہ'' کا ترجمہ بھی شامل ہے۔آئن بیڈفورڈ کہانیاں پڑھتے پڑھتے اس کہانی پر اٹک گئے اور ایسے اٹکے کہ اس کا تجزیہ کرتے کرتے ایک پورا مقالہ لکھ ڈالا جو ''جرنل آف کامن ویلتھ لٹریچر'' میں شائع ہوا۔اور اب اردو میں ترجمہ ہو کر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی مرتب کتاب ''انتظار حسین' ایک دبستان'' میں شامل ہے۔ان سے پہلی ملاقات انہیں دنوں ہوئی تھی جب انہوں نے تازہ تازہ یہ کہانی پڑھی تھی اور اس کے مصنف کی تلاش میں تھے۔

پچھلے برسوں میں پھر لاہور کا دورہ ہوا تو آ کر ملے۔کہا کہ میرے پاس دو خوش خبریاں ہیں۔ایک تو یہ کہ میں نے آپ کی ساری کہانیاں ناول پڑھ ڈالے ہیں۔

میں نے پوچھا ''وہ کیسے۔آپ اردو تو جانتے نہیں۔انگریزی میں جتنا ترجمہ ہوا ہے اتنا ہی پڑھا ہوگا۔''

کہا کہ ''ان برسوں میں میں نے اردو سیکھ لی ہے۔''

''بہت اچھی خبر ہے۔''

''دوسری خبر۔میں نے شادی کر لی ہے۔''

''یہ ہوئی خوشخبری۔''

''مگر کس سے کی ہے۔میں ہندوستان میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ہماری فیلڈ میں ایک تامل لڑکی بھی کام کر رہی تھی۔بس اس سے میری شادی ہوگئی۔وہ اسی ہفتے پہنچنے والی ہے۔آپ اس سے ملنا چاہیں گے۔''

''یقیناً''

''مگر وہ مسلمانوں کے بہت خلاف ہے۔کہتی ہے کہ یہ سب Fundamentalist ہوتے ہیں۔پاکستان کو سمجھتی ہے کہ یہ FUNDAMENTALISTS کا ملک ہے۔سو پاکستان کے بارے میں بھی اس کی رائے سخت مخالفانہ ہے۔''

میں نے کہا ''پھر تو آپ کی بیگم سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔''

''میں نے آپ کی کچھ کہانیاں اسے پڑھوائیں۔ آپ کو تو اس نے رعایتی نمبر دے دیئے۔ مگر مسلمانوں اور پاکستان کے بارے میں اپنی رائے پر شدت سے قائم ہے۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔ ملاقات ہونی چاہیے۔''

جب بیگم کو لے کر ملاقات کے لیے آئے تو تیسری خوشخبری سنائی۔ آتے ہی قہقہہ لگایا اور اطلاع دی ''ہماری بیگم کی رائے بدل گئی۔ اور آج ہی بدلی ہے۔''

''وہ کیسے۔''

کہا کہ ''ہم آج سارے دن لاہور میں گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔ ایک نوجوان ہمارا گائیڈ بن گیا۔ بازار بازار لیے پھرا۔ جس بازار گئے' جس دکاندار سے ملے وہ یہ جان کر کہ ہماری بیگم ہندوستان سے آئی ہے بہت خوش ہوا۔ ہر ایک نے بہت آؤ بھگت کی۔ پھر ہم مسجد وزیر خاں دیکھنے کے لیے گئے۔ میں نے بیگم سے کہا کہ تم ہندو ہو۔ تمہیں وہ لوگ مسجد نہیں دیکھنے دیں گے۔ تو بتانا مت کہ ہندو ہو۔ مگر انہوں نے وہاں پہنچتے ہی مسجد کے امام صاحب سے کہا کہ میں ہندو ہوں' ہندوستان سے آئی ہوں۔ سنا ہے کہ یہ ایک تاریخی مسجد ہے' اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور دیکھو۔ ہاں اپنے جوتے باہر اتار دو۔ ایک لڑکے سے کہا کہ دیکھو یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی جوتیوں کا خیال رکھو۔ تو انہوں نے خوشی خوشی انہیں مسجد دکھائی۔ تو بس آج آج میں مسلمانوں کے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں ان کی رائے بدل گئی۔''

اس پر مسز بیڈفورڈ بولیں ''بات یہ ہے کہ پروپیگنڈا بہت ہے۔ دور سے کچھ نظر آتا ہے۔ قریب جا کر دیکھو تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔''

اس سے میرا دھیان مرہٹی زبان کے ڈرامہ نگار وجے ٹنڈولکر کی طرف مڑنے لگا ہے۔ پچھلے ہی برسوں میں میں نے ان کے ایک دو ڈرامے پڑھے تھے۔ ایک ڈرامہ SILENCE, THE COURT IS IN SESSION اتنا بھلا لگا کہ اسے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ لاہور کے ایک گروپ نے اسے سٹیج بھی کیا تھا۔ ڈھاکہ کے جس سیمینار کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس میں وہ آئے ہوئے تھے۔ اس طرح ان سے ملاقات کی تقریب پیدا ہوئی۔ بحث مباحثہ میں ذرا جو انہوں نے حصہ لیا ہو۔ سب بول رہے ہیں' یہ چپ بیٹھے ہیں۔ محفل میں شامل بھی' محفل سے بے تعلق بھی۔ آخری سیشن میں انہیں اپنا پیپر پڑھنا تھا۔ مگر ادھر وہ نشست شروع ہو رہی

تھی ادھر یہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ''آپ کے تاثرات سے تو ہم محروم ہی رہے۔ اب اس سیشن میں آپ کو اظہار خیال کرنا تھا تو آپ جا رہے ہیں۔

بولے ''میری جو سمجھ میں آیا وہ میں نے لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ پتہ نہیں وہ تحریر ان کے سیمینار کے مطلب کی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ باقی وہ جانیں ان کا کام جانے۔''

اور یہ تحریر کیا تھی۔ عنوان تھا: MUSLIMS AND I ''مسلمان لوگ اور میں۔'' بتایا تھا کہ میں نے ایسی سوسائٹی میں آنکھ کھولی جس میں مسلمان کا گزر ہی نہیں تھا۔ ان کے متعلق پروپیگنڈا بہت تھا کہ بہت وحشی' جاہل اور خونخوار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ان کے تصور سے خوف کھاتا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ سکول میں میری کلاس میں ایک قصائی کا لڑکا تھا۔ اس سے دوستی ہو گئی۔ دوستی اتنی بڑھی کہ میں نے اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے ماں باپ کو دیکھا۔ سب ہی بہت اچھے لوگ نظر آئے۔

تو یہ تھا وجے ٹنڈولکر کا مسلمانوں سے پہلا تعارف۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے تصور میں مسلمانوں کا امیج بدلتا چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے انت مورتی یاد آنے شروع ہو گئے ہیں۔ کنڑ زبان کے ناول نگار۔ لمبا قد' بھرا بھرا جسم' کھچڑی ڈاڑھی' گندمی رنگ' بات کس رسانیت سے کرتے ہیں اور کس توجہ سے سنتے ہیں۔ کھٹمنڈو میں دیکھا کہ اصغر علی انجینئر کی باتیں کچھ زیادہ ہی توجہ سے سن رہے ہیں۔ اور اصغر علی انجینئر کی تو ہر بات گویا اسلام کے کسی تصور کسی خیال کی تشریح تھی۔ اور انت مورتی ہیں کہ ان سے سوال کیے جا رہے ہیں اور جو وہ کہتے ہیں اسے پورے دھیان سے سنتے ہیں۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ سو میں نے انت مورتی جی کو ذرا کریدا۔ تب وہ کھلے ''بولے کہ آج کل میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلام کس قسم کا فینومینا ہے۔ آخر ہندوستان میں اتنے مسلمان بستے ہیں۔ مجھے یہ سمجھنا چاہیے۔''

سمجھتے سمجھتے وہ اب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر تک کے بارے میں ان کی رائے اچھی خاصی ہمدردانہ ہے۔ یہ کہ وہ بہت متعصب بادشاہ تھا' یہ ماننے میں انہیں تامل ہے۔ دلیل پہ لاتے ہیں کہ بنارس یونیورسٹی کے بیچ ایک پرانی لاٹھ کھڑی ہے۔ اس پر اورنگ زیب کی طرف سے ایک حکمنامہ کندہ ہے جو یہ ہے کہ کسی مندر کو ڈھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

بات یہ ہے کہ یوں تو ہندوستان میں جو پچھلے برسوں میں آنا جانا ہوا اس میں کتنے ہندی اور دوسرے ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں مگر جو بات انت مورتی کی شخصیت میں دیکھی وہ کسی میں نظر نہ آئی۔ ارے ان کی تو کھچڑی ڈاڑھی میں بھی ایک کشش ہے۔ بلکہ ان کی شخصیت میں جو دلاویزی ہے وہ آدھی اس ڈاڑھی کی مرہون منت ہے۔ انہیں کے اصرار پر تو میں نے

آصف فرخی کو ساتھ ملا کر ساہتیہ اکیڈیمی کے لیے پاکستانی افسانوں کا پچاس سالہ انتخاب کیا تھا۔ ڈھاکہ کے سیمینار میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر آپ جنوبی ایشیا کی قوموں کے بیچ افہام و تفہیم کے خواہاں ہیں تو کوئی ادارہ ترجمہ قائم کیجیے جو اس خطہ کی زبانوں کے ادب کو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان میں ترجمہ کرے۔ اس بات کو انہوں نے پکڑ لیا اور مجھ سے کہا کہ پتہ نہیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ تم میرے کہنے پر ساہتیہ اکیڈیمی کے لیے پاکستانی افسانوں کا ایک انتخاب کر دو۔ اکیڈمی اسے اردو کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کروا کے شائع کرے گی۔ اس وقت تک وہ ساہتیہ اکیڈیمی کے کرتا دھرتا تھے۔ چیئرمین یا نائب چیئرمین جو بھی ہوں۔ مگر میں تو ان کی ڈاڑھی کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی ڈاڑھی کیسی خوب اور مرغوب ڈاڑھی ہے۔ بہت گھنی بھی نہیں۔ ایسی چھدری بھی نہیں۔ نہ بہت کالی نہ بہت سفید۔ سفیدی اور سیاہی دونوں ایک اعتدال کے ساتھ۔ مطلب وہی کہ کھچڑی ڈاڑھی۔

اصل میں ڈاڑھیاں بھی تو رنگ رنگ کی ہوتی ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ڈاڑھی تعصب اور تنگ نظری کی چغلی کھائے اور ایسی گاڑھی ہو کہ ہمیں آپ کو کھانے کو آئے۔ اب میں شناساؤں دوستوں کی ڈاڑھیاں جو جو مجھے یاد آتی جاتی ہیں گننی شروع کرتا ہوں۔ سدھیر کی ڈاڑھی' الوک بھلہ کی ڈاڑھی' غلام محمد شیخ کی ڈاڑھی' محمد عمر میمن کی ڈاڑھی' اصغر علی انجینئر کی ڈاڑھی۔ وہ جو بنیاد پرستانہ ڈاڑھی ہوتی ہے جھاڑ جھنکاڑ قسم کی' جس سے وحشت ٹپکتی ہے اور دلوں میں دہشت بیٹھ جاتی ہے اس کی جھلک ان میں سے کسی ڈاڑھی میں بھی نظر نہیں آئے گی۔ سدھیر سے تو کھٹمنڈو ہی میں گیتا نجلی کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ جب میں نے گیتا نجلی کی انگلی کی سیدھ میں نظر دوڑا کر گوری شنکر کے درشن کر لیے یعنی دل بادل میں غرق اس پربت کو جو گوری شنکر سے منسوب ہے اور ان دونوں کے ساتھ مندر مندر گھوم لیا تو جان لیا کہ اب ہم ان کے اور وہ ہمارے دوست ہیں۔ اسی منڈلی میں اپنی طرز کے مصور اور اپنے رنگ کے آدمی غلام محمد شیخ بھی تھے۔ ان سے بھی گاڑھی چھننے لگی۔ وہیں اصغر علی انجینئر سے بھی گاڑھی چھننی شروع ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ کھٹمنڈو کے سیمینار میں ڈاڑھیاں بہت تھیں۔ ٹیگور ین ڈاڑھی سے لے کر اصغر انجینئر کی مسلمانی ڈاڑھی تک۔

الوک بھلہ نے اپنے چھریرے بدن اور چھریری ڈاڑھی کے ساتھ لاہور کا ایک پھیرا لگایا تھا جب وہ تقسیم کے ہنگام لکھی ہوئی کہانیوں پر کام کر رہے تھے۔ چلتے چلاتے میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میری کہانیوں یہ ایسے ریجھ جائیں گے کہ ترجمہ پہ ترجمہ کرتے چلے جائیں گے۔

اور محمد عمر میمن جن کی مختصر بھوری ڈاڑھی کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ مجھے تو کبھی اس ڈاڑھی سے کسی تعصب کی بو نہیں آتی۔ ہمیشہ

اس سے خوشگوار مہک ہی آئی۔ مگر جب انہوں نے لاہور آ کر حلقہ ارباب ذوق میں اپنا مقالہ پڑھا تو تین شیعہ انقلابیوں نے وہاں کچھ اور سونگھا۔ میمن نے کہا یہ کہ شیعہ روایت کے پس منظر میں میرے ناول ''بستی'' کا ایک تجزیہ پیش کر ڈالا۔ اور شیعہ روایت کی انہوں نے توجیہہ اس طرح کی کہ واقعہ کربلا سے اس گروہ کے یہاں ایک احساس مظلومی پیدا ہو گیا اور عمل کی جگہ گریہ وزاری' نے لے لی۔ اتفاق سے اس جلسہ میں تین ایسے دانشور موجود تھے' آغا سہیل' رضی عابدی' اشفاق نقوی جن کی مارکسیت میں اب امام خمینی کے انقلاب کا ذائقہ بھی شامل ہو گیا تھا' یعنی ان کا انقلابی مزاج دو آتشہ ہو گیا تھا۔ انہیں شیعیت کی یہ تعبیر بالکل نہیں بھائی۔ انہیں گمان ہوا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے امام بن تیمیہ پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اسی اثر میں شیعوں کو اس نے دیکھا اور سمجھا ہے حالانکہ واقعہ کربلا تو اپنے جلو میں ایک انقلاب لایا تھا جس سے اس گروہ میں ایک انقلابی روح پیدا ہوئی۔

یہ دانشور جب محمد عمر میمن کے استدلال پر گرم و سرد ہو رہے تھے تو انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ آپ نہیں بول رہے۔ میں کیا بولتا۔ میں نے اپنے نہ بولنے کی وجہ بھی انہیں مختصراً بتا دی تھی۔ ایک تو یہ کہ میری جذباتی تربیت تو انیس و دبیر کے مرثیوں کے سائے میں ہوئی ہے

''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے''

مرثیے کے ایسے مقامات پر میں سر دھنتا ہوں م۔ جوش صاحب کے مرثیے مجھے مرثیے نظر نہیں آتے۔ واقعہ کربلا کے ساتھ انقلاب کا نعرہ جوش صاحب کی طرف سے آئے یا علی شریعتی کی طرف سے میرے حلق سے نہیں اترتا۔ انسان بالآخر بیدار ہو گا اور پکارے گا کہ ہمارے ہیں حسین۔ یہ بات مجھے بالکل اپیل نہیں کرتی۔ خود انسان کی بیداری کا معاملہ مشکوک ہے۔ جتنا بیدار ہوا ہے اس سے کونسی فلاح کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ یہی ہو گا نا کہ مزید بیدار ہوا تو مزید ایٹم بم بنائے گا' یا ایٹم بم سے بھی بڑھ کر کوئی بم شے۔

دوسری بات۔ افسانہ نگار ہو یا شاعر ہو اسے نقاد کے ساتھ جرح نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا کام لکھنا ہے۔ باقی قارئین جانیں اور نقاد جانیں کہ وہ اسے کس طرح پڑھتے ہیں اور کیا معنی ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مگر مجھے جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور پھر میں نے چپ سادھ لی۔ اور اپنے دفاع کا کام اپنے ہمدردوں کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ اس موقعہ پر ہوا تھا جب میں نے دہلی یونیورسٹی میں جا کر استادوں اور طلباء کی محفل میں اپنا افسانہ ''یاں آگے درد تھا'' سنایا تھا۔ اس کہانی میں تقسیم سے پہلے کی ایک صورتحال ہے کہ ایک کالج میں طلباء آپس میں شیر و شکر ہیں مگر

رفتہ رفتہ سیاسی پارٹیوں کے اثرات وہاں پہنچتے ہیں۔ کالج کے بیچ ایک درخت ہے۔ ایک دن ایک پارٹی کا جھنڈا وہاں لہراتا نظر آتا ہے۔ اگلے دن وہ جھنڈا اتر جاتا ہے اور دوسری پارٹی کا جھنڈا اس کی جگہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ بھی اتر جاتا ہے۔ تیسری پارٹی کا جھنڈا لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ بس اس کے ساتھ کالج کی فضا کشیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

چھوٹتے ہی ایک اعتراض آیا ''سب سے پہلے کانگریس کا جھنڈا اس درخت پر نصب کیا جاتا ہے۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ فتنہ فساد کانگریس کی طرف سے شروع ہوا۔''

بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

کہانی لکھتے وقت یہ نکتہ بیشک میرے ذہن میں نہیں تھا۔ مگر کیا پتہ ہے کہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قلم نے مجھے بتائے بغیر اس خیال کو وہاں سے لپک لیا۔ آخر افسانہ نگار کا قلم ہر بات افسانہ نگار کے شعور سے پوچھ کر تو نہیں لکھتا۔ وہ تو شعور اور غیر شعور کی سرحد پر دوڑتا رہتا ہے۔

تو پہلے معترضین کی یورش مجھ پر ہوئی۔ پھر دو گروہ بن گئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ نارنگ صاحب' ریوتی' ڈاکٹر شارب ردولوی سب باری باری اپنی استدلالی مہارت کو بروئے کار لائے اور میرا دفاع کیا۔ مگر کسی کی بات نہیں سنی گئی۔ ایسے میں ایک خوش رو' خوش پوش' خوش گفتار بی بی کھڑی ہوئی اور منہ سے ایسے پھول برسائے کہ بھڑکتی آگ دیکھتے دیکھتے بجھ گئی۔ کوئی اپنے نجات دہندہ کو بھولا کرتا ہے اور بالخصوص اس صورت میں کہ نجات دہندہ ایک خوش رو خوش گفتار خاتون ہو۔ یہ تھیں شمع فتح علی۔ اگلے پھیرے میں ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی تو انہوں نے مجھے اپنا ناول دیا تھا۔ ''TARA LANE''۔ وہ میں نے پڑھ لیا۔ اگلے پھیرے میں ان سے مڈھ بھیڑ ہوئی تو انہوں نے اپنی نئی کتاب مجھے عنایت کی۔ یہ میرابائی کے بھجنوں کا انگریزی ترجمہ تھا۔ اس کے بارے میں میں نے ان سے وہیں کہہ دیا تھا کہ ''کتاب بہت اچھی لگ رہی ہے۔ مگر میرے لیے اسے پڑھنا مشکل ہوگا۔''

وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ میرابائی کو انگریزی میں پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انگریزی میں منتقل ہو کر بھجن نظم بن جاتا ہے' بھجن نہیں رہتا۔ کبیر اور میرابائی' ان کے انگریزی ترجمے جب بھی نظر آئے میں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مجھے ضد ہے کہ ان شاعروں کو اگر پڑھنا ہے تو انہیں کی زبان میں پڑھنا ہے۔ بیشک وہ زبان مجھے بس آدھی پدھی سمجھ میں آتی ہو۔ ارے جہاں سمجھ میں نہیں آئے گا وہاں علی سردار جعفری سے مدد لے لیں گے۔ ''کبیر بانی'' اور ''پریم وانی'' یہ دو کام انہوں نے کمال کے کیے ہیں۔ اردو والوں کے لیے کبیر اور میرابائی کو سہل بنا دیا۔ دوہا کے پھیرے میں ان سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے ان دو کاموں پر انہیں جی بھر کر

خراج تحسین پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے کہا کہ ایسا ہی کام میں نے غالب کے سلسلہ میں کیا ہے اور میر کے سلسلہ میں کر رہا ہوں۔ غالب کے کام کی اس وقت میرے پاس ایک ہی جلد ہے۔ دوسروں سے نظریں بچا کر تمہیں دوں گا۔ وہ جلد انہوں نے چپکے سے مجھے عنایت کی۔ میں نے اسے سر آنکھوں سے لگایا۔ کبیر اور میرابائی کو انہوں نے اردو والوں کے لیے آسان بنایا تھا۔ اسی نہج پر غالب کو ہندی والوں کے لیے سہل بنایا ہے۔

علی سردار جعفری' ترقی پسند تحریک کی شاندار یادگار

''آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم''

عمر کے ساتھ آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں۔ ہاں طبیعت میں اعتدال آ گیا ہے۔ لہجہ نرم ہو گیا ہے۔ سو مجھے اچھے لگنے لگے ہیں۔

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

آوارہ یادیں کہاں کہاں لیے پھریں۔ ہر پھر کر وہی لاہور، پھر اس کے وہی صبح و شام، شامیں تو بہت برتیں، مگر صبحوں کا بھی تو اپنا ایک عالم ہوتا ہے۔

منہ اندھیرے کبھی اٹھ کر دیکھو
کیا تر و تازہ ہوا ہوتی ہے

ایسی ہی ایک صبح تھی۔ میں جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ باغ جناح کی طرف جا رہا تھا۔ ایک موٹر تیزی سے میرے برابر سے گزری۔ تھوڑی دور جا کر ریورس گیر لگا۔ میرے قریب آ کر رکی۔ ایک صاحب نے منہ نکال کر پوچھا ''آپ شاید انتظار حسین ہیں۔''

''جی۔''

''یہ بتایئے آپ کا جو افسانہ ''فراموش'' ہے اس کا مطلب کیا ہے۔''

میں پریشان ہوا۔ اچانک پکڑا گیا تھا۔ موصوف عجلت میں تھے اور جلدی جواب چاہتے تھے۔

میری پریشانی دیکھ کر بولے ''دیکھئے اب تو یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اصل میں ڈاکٹر ہوں۔ یہ افسانہ ہمارے کورس میں تھا۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا تھا۔ خیر یہاں سے کورس پورا کر کے میں امریکہ چلا گیا۔ اب واپس آیا ہوں اور سروسز ہسپتال میں ہوں۔ وہیں جا رہا ہوں۔ آپ نظر آ گئے تو میں نے سوچا لگے ہاتھوں پوچھ ہی لیا جائے کہ اس افسانے کا مطلب کیا ہے۔''

میں نے کہا ''چھوڑیئے۔آپ کا وہ مشکل وقت گزر ہی گیا۔اب اس کا مطلب پوچھ کر کیا کریں گے۔''

بولا ''یہ بھی ٹھیک ہے۔ویسے کیا آپ محکمہ تعلیم سے متعلق ہیں۔''

''نہیں۔''

''پھر یہ افسانہ نصاب میں کیسے شامل ہوگیا۔''

''ایسے کام سفارش سے بھی تو ہوجاتے ہیں۔''

میری یہ بات اس نے بہت سنجیدگی سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔پھر آہستہ سے بولا ''پھر کوئی بڑی سفارش ہوگی۔'' یہ کہہ کر گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے گزر گیا۔

''فراموش'' پر موقوف نہیں۔اس سے پہلے ایک اور افسانہ ''کایا پلٹ'' شاید انٹر کے کورس میں شامل ہوگیا تھا۔اس نے بھی طلباء اور طالبات کے لیے ایسی ہی مشکلات پیدا کی تھیں۔مگر مجھے جتنے فون آئے وہ سب طالبات کے تھے۔اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ طلباء کو زیادہ پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ایک افسانہ اگر سمجھ میں نہیں آیا تو نہ آئے۔ایسا کونسا بھاری فرق پڑ جائے گا۔مگر طالبات کے استفسار کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔کسی بھی صبح کسی طالبہ کا فون آجاتا ''یہ آپ نے جو ''کایا پلٹ'' لکھا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔''

ایک طالبہ سے میں نے پوچھا ''آپ نے اپنی استانی سے کیوں نہیں پوچھا۔''

''جی پوچھا تھا۔انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میری سمجھ میں تو یہ کہانی آئی نہیں۔اس کا لکھنے والا اسی شہر میں کہیں رہتا ہے۔اس کا اتا پتہ معلوم کرو اور اس سے مطلب پوچھ لو۔''

ہاں صبحوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ایک صبح اسی طرح باغ جناح کی طرف جا رہا تھا کہ ایک سائیکل سوار قریب سے گزرتے گزرتے رکا۔سائیکل سے اتر کر میرے قریب آیا ''انتظار صاحب' آپ ایک لاہور نامہ میرے کہنے سے بھی لکھ دیجئے۔بہت ضروری ہے۔ایک ہفتے کے بعد لاہور میں بہت بڑا زلزلہ آئے گا۔پورا شہر ڈھے جائے گا۔لوگوں کو بتایئے کہ انہوں نے جتنے پرندوں کو قید کر رکھا ہے ان سب کو رہا کر دیں۔پھر یہ زلزلہ ٹل سکتا ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ لاہور نامہ اب میں نہیں لکھتا۔مشرق بند ہو چکا ہے۔اس دفتر کو گائے چر گئی۔گائے کو قصاب لے بھاگا۔

''اچھا۔پھر کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے بہت مایوسانہ لہجہ میں کہا اور سائیکل پر سوار ہو آگے نکل گیا۔

کوئی ڈھائی تین مہینے کے بعد ایک صبح میں نے اسے دیکھا کہ سائیکل پر دوڑا چلا جا رہا ہے۔میرے برابر سے گزرا۔وہ تو گزرا

چلا جا رہا تھا۔ میں نے ہی اسے روکا۔ کہا کہ ''بھائی جس زلزلہ کی آپ نے خبر دی تھی وہ تو نہیں آیا۔''

بولا ''پتہ ہے کیوں نہیں آیا۔''

''مجھے کیا پتہ۔''

''ہوا یوں کہ جب آپ نے مجھے جھنڈی دکھا دی تو میں دوڑا ہوا پرانی انارکلی گیا۔ طوطوں سے بھرا ایک پنجرہ خریدا۔ فوراً ہی سب طوطوں کو اڑا دیا۔ دوسرے دن بھی یہی کیا۔ پھر تیسرے دن بھی۔ اس طرح زلزلہ ٹلا ہے۔ مگر پرندے اب بھی بہت سارے اس شہر میں پنجروں میں بند ہیں۔ میرے پاس اتنا کہاں ہے کہ روز پنجرے خرید خرید کر طوطے اڑاؤں۔ تو زلزلہ تو آنا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اس شخص سے اتفاق کیا۔ ان گنت پرندے پنجروں میں قید ہیں۔ ان گنت درخت کاٹے جا چکے ہیں۔ پتہ نہیں کب اس شہر سے ان پرندوں اور درختوں کا حساب لے لیا جائے۔

پاکستان کے ابتدائی برسوں میں جب میں فیروز پور روڈ پر نہر کے متصل رہتا تھا تو جب بھی کسی صبح کو نور کے تڑکے آنکھ کھل جاتی میں نہر کی طرف نکل جاتا۔ وہاں ایک شخص اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتا نظر آتا۔ ٹہلتا کم تھا۔ ٹہلنے والوں پر زیادہ نظر رکھتا تھا۔ اس زمانے میں نہر کے کنارے کنارے پھول کھلے بہت نظر آتے تھے۔ جہاں کسی سیلانی نے پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے ہانک لگائی ''پھول مت توڑو۔'' اس کے ساتھ کتا بھونکنا شروع کر دیتا۔ سیلانی گھبرا جاتا۔

اس کتے سے میرا دھیان دو اور کتوں کی طرف جا رہا ہے۔ یہ 1948ء کا ذکر ہے۔ عسکری صاحب اور میں شام پڑے مال کی طرف نکل جاتے تو ادبدا کر ایک نوجوان سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ چھریرا بدن' لمبا قد' کھلتا ہوا رنگ۔ اپنی بھڑکیلی شرٹ اور ٹھاٹ دار پتلون کے ساتھ بہت سمارٹ نظر آتا تھا۔ اپنے ٹامی کو لے کر نکلتا تھا۔ مستقل اسے روکتا ٹوکتا چلتا۔ ہمارے قریب آ کر عسکری صاحب کو سلام کرتا اور پھر اپنے ٹامی سے باتیں کرتا آگے نکل جاتا۔

میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ یہ کون نوجوان ہے۔

کہا ''اس کا نام انور جلال ہے۔''

اگلے چند برسوں میں اس سے اس طرح تعارف ہوا کہ شاعری کرتا نظر آیا۔ پھر افسانے میں خامہ فرسائی کرتا دکھائی دیا۔ پھر اس کا ایک ناول شائع ہوا۔ اور اچھا بھلا ناول تھا۔ پھر قلم کے ساتھ اس کے ہاتھ میں موقلم نظر آیا۔ اسی کے ساتھ اس کے نام کے ساتھ شمزا کا لاحقہ لگ گیا۔ اب وہ انور جلال شمزا تھا اور ادیبوں کے ساتھ کم اور مصوروں کی صحبت میں زیادہ دکھائی دینے لگا۔ ٹی ہاؤس سے کافی

ہاؤس کی طرف۔ کافی ہاؤس سے ٹی ہاؤس کی طرف۔ تھوڑا ادب زیادہ مصوری۔ اور مصوری کے بہانے باہر نکل گیا۔ مصوری میں اس کے کام کی خوشبو پاکستان تک آئی۔

زمانے بعد ایک سہ پہر میں نے ٹی ہاؤس میں قدم رکھا تو دیکھا کہ انور جلال بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر چلایا "یار میں اتنی دیر سے یہاں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی آشنا صورت نظر نہیں آ رہی۔ ناصر تو دنیا سے چلا گیا۔ باقی یار کہاں گئے۔"

"بس جیسے تم چلے گئے ویسے دوسرے بھی جس کے جہاں سینگ سمائے نکل گیا۔"

یہ اس کا شاید پاکستان کا آخری پھیرا تھا۔ پھر تو وہ آیا نہیں۔ اس کی خبر ہی آئی۔

دوسرے کتے کو میں نے دیکھا نہیں' اس کا ذکر عبادت صاحب سے سنا۔ یہ غلام عباس کا کتا تھا جس کا نام حلقہ ارباب ذوق کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہیے۔ عبادت صاحب بتاتے تھے کہ 1947ء میں 3 جون کے اعلان کے بعد کتنے یار جو دلی کے حلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے پاکستان چلے گئے۔ غلام عباس ابھی موجود تھے۔ شہر میں حالات بہت خراب تھے۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ آ گیا اتوار۔ غلام عباس کا گھر میرے گھر سے قریب ہی تھا۔ ان کا پیغام آیا۔ میں ان کے یہاں پہنچ گیا۔ کہنے لگے کہ آج اتوار ہے۔ حلقہ کا جلسہ نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کرفیو میں کون آئے گا۔ کہنے لگے کہ ہم اپنے گھر پہ جلسہ کیے لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مگر لوگ کہاں ہیں۔ بولے کہ دیکھئے میرے پاس نیا افسانہ پڑھنے کے لیے موجود ہے۔ آپ صدر بن جائیں گے۔ میں نے کہا "اور سامعین کہاں سے آئیں گے۔"

اس پر عباس صاحب نے تھوڑا سوچا۔ پھر اندر گئے۔ اور اپنے کتے کو پکڑ کر لائے۔ بولے "لیجئے سامعین کا انتظام بھی ہوگیا۔ ہمارا ٹامی ہمارا افسانہ سنے گا۔" پھر اسے پچکار کر بٹھایا۔ کہا کہ "ٹامی تمہیں میرا افسانہ سننا ہے۔"

سو میں صدر بنا۔ غلام عباس نے افسانہ پڑھا۔ ٹامی نے یہ افسانہ سنا۔ اس طرح 1947ء کے پرآشوب دنوں میں دلی میں حلقہ کا جلسہ ہوا۔

اب ایک بالکل مختلف قسم کی صبح یاد آ رہی ہے۔ صبح ہی صبح گھر سے نکلا اور جہاز میں جا بیٹھا۔ کشور ناہید ہمسفر ہیں۔ جرنیل ضیاء الحق کے دربار میں ہماری طلبی ہے۔ کس جرم میں۔ ابھی بتاتا ہوں۔

ادب سے اس پیشی کا تعلق نہیں ہے۔ یہ فلموں کا چکر ہے۔ اس زمانے میں کشور ناہید اور میں دونوں ہی فلم سنسر بورڈ کے رکن تھے۔ اس واسطے سے مجھے بس ایک ہی شخصیت اس وقت یاد آ رہی ہے سنتوش کمار کہ وہ بھی ان دنوں اس بورڈ کے رکن تھے اور جو

گاڑی انہیں لینے جاتی تھی وہ رستے میں سے مجھے بھی بٹھا لیتی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور سنتوش کمار نے پانوں کی ڈبیا کھولی۔ کس سلیقہ اور محبت سے پان پیش کرتے تھے۔ میں نے پان ناصر کے ساتھ بہت کھائے تھے۔ وہ زمانہ گزر گیا تو پان کھانا ہی چھوڑ دیا۔ اب سنتوش کمار کی صحبت میں پھر پان کھانے شروع کر دیئے تھے۔ بلکہ بہت سی فلمیں تو ایسی ہوتی تھیں کہ اگر سنتوش کمار کی پانوں کی ڈبیا اور چھالی الائچی کے بٹوے کا سہارا نہ ہوتا تو پتہ نہیں ہمارا کیا حال ہوتا۔ کیا باغ و بہار آدمی تھے اور کیسے بانکے سجیلے۔ میں نے شروع میں انہیں اس وقت دیکھا تھا جب 1948ء کے اوائل میں مسعود پرویز کی فلم میں جس کی کہانی منٹو صاحب نے لکھی تھی ہیرو کا رول ادا کر رہے تھے اور منٹو صاحب کہتے تھے کہ یہ نوجوان پاکستان کا دلیپ کمار بنے گا۔ یا اب دیکھ رہا تھا جب وہ اداکاری کے کاروبار سے فارغ ہو چکے تھے۔ مگر اسی طرح سرخ و سفید۔ وہی سیفد براق کرتا پائجامہ۔ قریب سے اب دیکھا۔ احساس ہوا کہ بہت باغ و بہار شخصیت ہیں۔ فلم کے بارے میں وہ کہہ دیتے کہ ہاں تو پھر میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ جب ہی تو فلم کے پاس فیل کے سلسلہ میں سفارش میرے پاس کم کم پہنچتی تھی۔ انہیں پتہ تھا کہ جو دو پنچوں سنتوش کمار اور کشور ناہید کی رائے ہوگی وہی اس شخص کی بھی رائے ہوگی۔ بس اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اصل رائے کے اظہار کی وہاں گنجائش کہاں تھی۔ اس حساب سے تو مشکل ہی سے کوئی فلم اس لائق نکلتی کہ اسے پاس کیا جا سکے۔

مگر جس حوالے سے اس بورڈ کی منظوریوں کے خلاف شور مچا وہ تھا عریانی کا مسئلہ۔ شور مچا کہ فلموں میں عریانی بہت بڑھ گئی ہے اور بورڈ ہے کہ ان فلموں کو پاس کئے چلا جا رہا ہے اور ایسے زمانے میں جب جرنیل صاحب اسلامی اخلاق پر زور دے رہے ہیں۔ سو ایک دن جرنیل صاحب نے پورے بورڈ کو طلب کیا۔

عریانی کے باب میں میرا معاملہ یہ تھا کہ ادب کے حوالے سے جو میرا نقطہ نظر بنا تھا اس سے الگ تو میں یہاں موقف اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تو اعتراض ہی اور تھا کہ پاکستانی فلمساز ابتذال پر اتر آتا ہے۔ وہ جو جسم کو دکھانے کے لیے ایک جمالیاتی شعور اور نزاکت احساس کی ضرورت ہے اس سے محروم ہے۔ ایک فلم میں مجھے ایک ایسا منظر نظر آیا تھا جو کسی حد تک اس شرط کو پورا کرتا تو اس کے حق میں البتہ میں نے شد و مد سے اپنی رائے پیش کی تھی۔ اور وہی رائے میرے لیے اب مصیبت بننے کو تھی۔ وہ منظر یہ تھا کہ ہیروئن جوروحی بانو تھی ایک سفید باریک ململ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہے اور نہا رہی ہے۔ اب روحی بانو دوسری فلمی اداکاراؤں کی قسم کی تو اداکارہ نہیں تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک تہذیب ہوتی تھی۔ میں نے اس فلم کی کہانی کے سیاق و سباق میں اس منظر کو بامعنی جانا اور اس کی وکالت کی۔ سنتوش کمار اور کشور نے بھی تائید کر دی اور لیجئے فلم اس منظر کے ساتھ پاس ہو گئی۔